چکی کے دو پاٹ

مغربی استعماریت اور اسلامی شدت پسندی

تخلیق۔۔پرویز ہود بھائی

ترجمہ۔۔خالد سہیل

بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ، جو جنوبی ایشیا میں رہتے ہیں، اسلامی تشدد پسندی کو سیاسی نظام میں عدمِ اعتماد، عوام کی غربت اور بے روزگاری اور مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کا ردِعمل سمجھتے ہیں۔ یہ سب ایسے آدھے سچ ہیں جن سے کوئی اختلاف نہیں کرسکتا۔ وہ عوام جو مایوسی اور ناامیدی کی زندگی گزارتے ہیں ان مذہبی رہنماؤں کے جال میں پھنستے چلے جاتے ہیں جو مذہبی تقریریں کرکے ان کے جذبات بھڑکاتے ہیں اور ان کو اگلی دنیا کے حسین خواب دکھاتے ہیں۔

بعض لوگ اسلامی شدت پسندی کا امریکی استعماریت کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ یہ بھی آدھا سچ ہے۔ ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے حادثے کے بعد امریکہ نے ساری دنیا کے مسلمانوں کے خلاف جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ امریکی جدید قدامت پسندوں (neo-conservatives) کا خیال تھا کہ وہ اپنی شدت پسندی کی چابک سے ساری دنیا کو راہِ راست پر لے آئیں گے لیکن یہ ان کی خوش خیالی تھی۔ ان کے جارحانہ اقدامات کا نتیجہ ان کی توقعات سے الٹا نکلا۔ امریکی جہالت، تکبر اور غیر دانشمندانہ رویوں کا فائدہ عراق میں مذہبی شدت پسندوں نے اٹھایا۔ وہ امریکی جو فاتحانہ انداز سے عراق آئے تھے اب دم دبا کر واپس جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ امریکی اپنی بے وقوفیوں کی وجہ سے عراق میں ایسے خطرناک سانپ کے بل چھوڑ کر جا رہے ہیں جہاں سے پیشہ ور دہشت گرد نکل کر دھیرے دھیرے ساری دنیا میں پھیل جائیں گے۔ امریکہ آہستہ آہستہ دنیا کے غیر مقبول ترین ممالک میں سے ایک ملک

بنتا جارہا ہے اور لوگ اوسامہ بن لادن سے زیادہ جورج بش سے نفرت کرنے لگ گئے ہیں۔ دنیا کے بہت سے مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ امریکہ نے تیل کی دولت کی لالچ میں اسرائیل سے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے جو اسلامی تاریخی مقامات پر قابض ہے۔ ان حالات سے القاعدہ نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ مسلمانوں کو یہ باور کروانا چاہتے تھے کہ یہ جنگ اسلام کے مجاہدوں اور دشمنوں کی اور حق اور باطل کی جنگ ہے۔ اب ان کے رہنما بڑے فخر سے کہتے ہیں۔۔۔ ہم نہ کہتے تھے!!

اسلامی شدت پسندی کو جنم دینے میں جس طرح غربت اور ناانصافی آدھے سچ ہیں اسی طرح استعماریت اور کلونیلزم بھی ادھورے سچ ہیں۔ انسانی شعور صرف مادی حالات سے ہی پیدا نہیں ہوتا اس میں تعلیم اور نفسیاتی تربیت بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہم سب اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ مذہبی شدت پسندی کی مدرسوں، مسجدوں اور انٹرنیٹ کی ویب سائٹس میں کس طرح تبلیغ ہوتی ہے جو لوگوں کے ذہنوں کو امن کی بجائے دہشت گردی کی طرف مائل کرتی ہے اور ان کی تنقیدی سوچ کو ختم کرتی ہے۔ مذہبی رہنماؤں نے ایسا ماحول تیار کر رکھا ہے جس میں اپنا احتساب کرنے کی بجائے مسلمانوں کے تمام مسائل کا مغربی دنیا کو ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ ایک طرف ایسی مسلمان ریاستیں ہیں جن کی حکومتیں غیر ذمہ دار اور ناپائدار ہیں اور دوسری طرف غیر مسلم ممالک کی وہ مسلم اقلیتیں ہیں جن کے رہنما اپنے مسائل خود سنجیدگی سے حل کرنے کی بجائے اتنا غصے میں آجاتے ہیں کہ اپنے مسائل کا ذمہ دار چند حقیقی اور چند خیالی دشمنوں کو ٹھہراتے ہیں۔

اسلامی شدت پسندی مسلمان قوم کے مستقبل کے لئے ایک برا شگون ہے۔ اس سے نہ صرف مسلمان ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں بلکہ باقی دنیا سے بھی ان کے تعلقات کشیدہ ہو جاتے

ہیں۔اس شدت پسندی سے نہ تو سیاسی مسائل حل ہوتے ہیں' نہ بدعنوان حکومتوں کا خاتمہ ہوتا ہے اور نہ ہی مسلمان معاشرے میں امن اور انصاف کی فضا قائم ہوتی ہے۔آج کے دور کی اسلامی مملکتوں میں شدت پسند مسلمان دوسرے فرقے کے مسلمانوں کو دشمن سمجھ کر انہیں بے دردی سے قتل کر رہے ہیں۔بعض شدت پسند مسلمان جدید اور سیکولر سوچ رکھنے والے مسلمانوں کو جاہلیہ کے پیروکار سمجھ کر ان پر لعنت بھیجتے ہیں اور انہیں ڈراتے ہیں کہ ان پر خدا کا عذاب نازل ہوگا۔وہ عورتوں کے بھی خلاف ہیں۔وہ نہ تو عورتوں کو بغیر نقاب کے بازاروں میں گھومتا دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں مردوں کے برابر حقوق و مراعات دینے کے لئے تیار ہیں۔

اسلامی شدت پسندوں کی گفتار اور کردار میں بہت بعد ہے۔وہ مسلمان عوام کے مسائل کو حل کرنے کے بارے میں فکرمند نہیں ہیں۔افریقی دارفور Darfur میں جب مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا اور بوزنیا اور چیچنیا میں جب مسلمانوں کا بے دردی سے خون بہایا گیا تو مسلمان ممالک میں کسی نے ان کے خلاف بڑے پیمانے پر احتجاج نہیں کیا۔امریکہ کے خلاف نعرے بازی کے باوجود عراق میں امریکی دہشت گردی کی مذمت میں اسلامی ممالک میں مسلمان مذہبی جماعتوں نے سڑکوں پر جلوس نہیں نکالے۔اس کے مقابلے میں جب ڈنمارک میں کارٹون چھپے یا سلمان رشدی کو انگلستان میں 'سر' کا خطاب ملا تو مسلمانوں کے مذہبی جذبات میں ابال آ گیا اور انہوں نے سڑکوں میں نکل کر جلوس نکالے' احتجاجی مظاہرے کئے اور مغربی سفارتخانوں کو آگ لگا دی۔آج کے مسلمان ایک نفسیاتی الجھن اور مذہبی دیوانگی کا شکار ہوتے جا رہے ہیں جن کا حقیقت سے رشتہ کٹتا جا رہا ہے۔ان کے لئے ایمان زیادہ اہم ہوتا جا رہا ہے مومن کم۔وہ اسلام کی خاطر دوسرے مسلمانوں کو قتل کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔

اسلامی شدت پسندی مختلف اسلامی ممالک کی سرحدوں کو پار کر کے اب عالمی ہوگئی ہے۔ایک مسلمان ملک کے مسائل اب صرف اس ملک کی حکومت سے ہی منسلک نہیں ہیں (اگر چہ اس ملک کی حکومت کی ذمہ داری زیادہ ہے)۔اگر ہم اپنی توجہ جنوبی ایشیا کے مسلمان ممالک پر مرکوز کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ اسلامی شدت پسندی نے نہ صرف پاکستان' افغانستان اور بنگلہ دیش کو متاثر کیا ہے بلکہ اس سے ہندوستان کی مسلم اقلیت کے حالات بھی دگرگوں ہو رہے ہیں اور ہندو اکثریت سے ان کا رشتہ خراب ہو رہا ہے۔

پاکستان میں شدید ردِعمل

پاکستان کے وہ علاقے جو افغانستان کی سرحد سے جڑے ہوئے ہیں اسلامی شدت پسندی کی گرفت میں آ چکے ہیں۔جوں جوں مذہبی اور قبائلی سوچ کا اثر بڑھتا جا رہا ہے پاکستان کی اسلام آباد کی حکومت کا کنٹرول کم ہوتا جا رہا ہے۔طالبان نے قبائلی علاقوں میں اپنی حکومت قائم کر لی ہے۔طالبان نے جو وڈیو بنا کر ساری دنیا میں تقسیم کئے ہیں ان میں شمالی وزیرستان کے علاقے میران شاہ میں' جہاں ان کا قانون نافذ ہو گیا ہے' چوروں' ڈاکوؤں اور مجرموں کی لاشیں بجلی کے کھمبوں سے لٹکی نظر آتی ہیں۔ان میں وہ سینکڑوں عوام بھی نظر آتے ہیں جو ان مناظر کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔لڑکیوں کے سکول بند کر دیے گئے ہیں اور حجاموں کو دھمکی دی گئی ہے کہ اگر تم نے کسی مسلمان مرد کی داڑھی کاٹی تو قبر میں اتار دیے جاؤ گے۔مولویوں نے پولیو کی ویکسین polio vaccine کو حرام قرار دے دیا ہے اور حکومت کے نمائندے اب بچوں کو وہ ویکسین نہیں دے سکتے۔شدت پسند طالبان اب شہر کی گلیوں میں دندناتے

پھرتے ہیں اور لوگوں کی شلوار کی اونچائی اور داڑھی کی لمبائی ناپتے ہیں اور سادہ لوح مسلمانوں کی مسجد میں نماز کی حاضری دیکھتے ہیں۔ یہ سب اسلامی شریعت نافذ کرنے کے شدت پسند طریقے ہیں۔

پاکستان میں مذہبی شدت پسندوں کی ایک نئی فوج تیار ہو رہی ہے جن کی اسلامی مدرسوں میں تربیت ہوئی ہے۔ انہوں نے گاؤں کے سیاسی رہنماؤں کی جگہ لے لی ہے اسی لئے اگست ۲۰۰۷ء میں پاکستان اور افغانستان کی حکومتوں اور قبائلی سرداروں کے درمیان جو 'امن کے جرگے' کی میٹنگ ہوئی تھی جس میں حامد کارزائی اور پرویز مشرف نے بھی شرکت کی تھی' ناکام رہی۔ بہت سے مقامی ملک اس لئے نہ آئے کہ ان کی جان کو خطرہ تھا۔ دونوں حکومتوں نے ان کی حفاظت کی ذمہ داری لی تھی لیکن وہ پھر بھی نہ مانے۔

پاکستان کے قبائلی علاقوں میں ملاؤں نے ریڈیو سٹیشن بنا رکھے ہیں اور وہ دوسرے فرقے کے مولویوں اور جدید سوچ اور طرزِ زندگی گزارنے والے لوگوں کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں۔ اپریل ۲۰۰۷ء میں شیعہ اور سنی ملاؤں نے صوبہ سرحد کے پاراچنار' ڈیرہ اسماعیل خان اور ہنگو کے علاقوں میں ایک دوسرے پر گولہ و بارود سے حملے کئے اور بیسیوں جانیں ضائع ہو گئیں۔ مئی ۲۰۰۷ء میں انصار الاسلام اور لشکرِ اسلام باڑے میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوئے اور ٹانک اور منگورا میں فریقین نے ایک دوسرے کا بے دردی سے خون بہایا۔

پاکستان کے قبائلی علاقوں میں طالبان کا اثر و رسوخ کافی پریشان کن تھا لیکن شدت پسندی کا پیمانہ اس وقت چھلکا جب طالبان نے اسلام آباد کی لال مسجد کو گھراؤ میں لے لیا اور اس پر چھ ماہ تک قابض رہے۔ اسلامی دہشت پسند عناصر شہر میں بدمعاشوں کی طرح گھومتے رہے اور سی ڈی اور وڈیو سٹوروں کو

جلاتے رہے اوران عورتوں کواغوا کرتے رہے جنہیں وہ طوائف سمجھتے تھے۔ وہ اپنے اخلاقی رویے دوسروں پر نافذ کرنا چاہتے تھے۔ یہ ڈرامہ کچھ عرصہ اور چلتا لیکن جب چینی عورتوں کواغوا کیا گیا تو چینی حکومت چوکنی ہوگئی۔ جب حالات بے قابو ہونے لگے تو پاکستانی فوج نے حملہ کیا اور اسلام پسندوں کا مقابلہ کیا۔ اس چھڑپ میں ۱۱۷ لوگ مارے گئے اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔ اس حادثے سے واضح ہوگیا کہ مذہبی شدت پسندوں نے، جن میں جیشِ محمد کے ارکان بھی شامل تھے (جنہوں نے کشمیر میں خودکش بمباروں کی روایت کا آغاز کیا تھا) شہر میں ڈیرے ڈال رکھے تھے جنہیں پاکستان کے خفیہ ادارے آئی ایس آئی (ISI) اور فوج نے نظرانداز کر رکھا تھا۔

جب امریکی حکومت کا دباؤ بڑھا تو پاکستانی فوج نے القاعدہ اور طالبان کے خلاف فوجی کاروائی کی لیکن مقابلہ سخت رہا۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ پاکستانی فوجیوں نے اپنے ملک کے باسیوں پر حملہ کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ یکم ستمبر کو وزیرستان میں ایک پورے فوجی وفد نے ایک بھی گولی چلائے بغیر ہتھیار ڈال دیے اور طالبان نے ۳۰۰ فوجیوں کو یرغمال بنالیا۔ حکومت اس وقت بہت پریشان ہوئی جب خفیہ پولیس کی گاڑی پر حملہ ہوا اور ۲۵ پولیس کے سپاہی مارے گئے۔ چونکہ گاڑی خفیہ تھی اس لئے واضح ہے کہ شدت پسند طالبان فوج کی صفوں میں گھس چکے ہیں۔ ان واقعات سے مغربی دنیا کی پریشانی بڑھ رہی ہے۔ اگست ۲۰۰۷ء کے امریکہ کے خارجہ پالیسی کے ایک رسالے کے اعداد وشمار کے مطابق ۵۳ فیصد ماہرین کا خیال ہے کہ افغانستان کے بعد پاکستان میں القاعدہ کا اثر ورسوخ بڑھ جائے گا۔ ۲۲ فی صد کا خیال ہے کہ پاکستان سے دوستی امریکی مفادات اور تحفظ کے لئے اچھی نہیں ہے۔

پاکستان کے ہمسائے

افغانستان کی حالت پاکستان سے بھی ابتر ہے۔ حامد کارزائی کی حکومت کا دائرۂ اختیار کابل تک محدود ہو گیا ہے۔ افیون کی فصل بڑھ رہی ہے اور لڑکیوں کی تعلیم کم ہو رہی ہے۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے حادثے کے بعد امریکیوں نے طالبان پر حملہ کر کے انہیں راکھ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن اس راکھ میں دبی چنگاریاں دوبارہ شعلے بن رہی ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ فوجی طاقت' سیاسی بصیرت اور افغانیوں کی معاشی امداد سے طالبان کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا جاتا لیکن امریکہ کی بصیرت کی کمی نے' جو ہر مسئلے کا فوجی حل تلاش کرتی ہے' افغانستان کے مسائل کو کم کرنے کی بجائے بڑھایا ہے اور اب افغانستان کا مسئلہ بڑھتے بڑھتے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں بھی پھیل گیا ہے۔ اگرچہ افغانی طالبان کی ظالمانہ حکومت نہیں چاہتے لیکن چونکہ کارزائی کی بے ضمیر حکومت نے مجرموں کا ساتھ دیا ہے اس لئے اس کا عوام کی نگاہوں میں اعتبار ختم ہو گیا ہے۔

بنگلہ دیش' جس کی پیدائش مذہب کی بجائے لسانی مسائل کی مرہونِ منت ہے' فوجی حوالے سے افغانستان سے زیادہ پاکستان کے قریب ہے۔ بنگلہ دیش میں جو بم پھٹتے ہیں اور مذہبی تشدد پسند حملے کرتے ہیں ان حملوں کی وجہ سے وہاں کی سیاست میں تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں بہت کم لوگوں نے سوچا ہو گا کہ جماعتِ اسلامی جس نے مغربی پاکستان کی فوج کا ساتھ دیا تھا بنگلہ دیش میں دوبارہ اتنی سیاسی طاقت حاصل کر لے گی۔ بنگلہ نیشلسٹ پارٹی کے' جو کچھ عرصہ پہلے برسرِ اقتدار تھی' جماعتِ اسلامی سے گہرے تعلقات ہیں۔ جماعتِ اسلامی کے کارندے گاؤں میں عورتوں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ حجاب

پہنیں اور مردوں سے کہتے تھے کہ لمبی داڑھی رکھیں۔ بائیں بازو کے بہت سے لوگ وہاں قتل کر دیے گئے' احمدی جماعت کے پیروکاروں کو جیل میں ڈال دیا گیا اور ہندو اقلیت کی زندگی اجیرن بنا دی گئی۔

پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان کی جمہوری روایت نے وہاں کے اسلامی تشدد پسندوں کو قابو میں رکھا تھا لیکن کشمیر میں اس کی آنچ تیز ہوگئی اور پھر ۱۹۹۲ء میں ہندو تشدد پسندوں نے بابری مسجد کو توڑ کر ہندوستان کی سیکولر روایت کو چیلنج کیا۔ اس حادثے نے تشدد کا ایک سلسلہ شروع کر دیا ہے جو آج بھی جاری ہے۔ صرف گجرات کے ۲۰۰۲ء کے حادثے میں ۲۰۰ مسلمان قتل کر دئے گئے تھے۔

پاکستان اور افغانستان کے مقابلے میں ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ وہ جبر کرنے سے زیادہ جبر کا نشانہ بنتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے غریب اور ان پڑھ ہیں کیونکہ بہت سے صاحبِ ثروت اور صاحبِ اختیار ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے تھے۔ ہندوستان میں پچھلی چند دہائیوں میں درمیانے درجے کے مسلمانوں میں اضافہ ہوا تھا اور وہ اپنے مسائل کا پرامن حل تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن جولائی ۲۰۰۶ء میں بمبئی کی ریل گاڑی میں بم پھٹنے اور اگست میں حیدرآباد کے حادثے کے بعد یوں لگتا ہے کہ وہاں بھی اسلامی شدت اور تشدد پسندی کی آگ بھڑکنے لگی ہے۔

امریکہ کو کیا کرنا چاہئے

اسلامی شدت پسندی صرف جنوبی ایشیا تک محدود نہیں ہے۔ پچھلے چند سو سالوں میں مسلمان اپنی عظمت کھو چکے ہیں اور مسلم قوم شکست خوردہ ہو کر اپنے زخم چاٹ رہی ہے۔ ۱۹۵۰ء میں جب عالمی

استعماریت کا دور ختم ہو رہا تھا' نئے مسلمان ممالک بن رہے تھے اور الجیریا سے انڈونیشیا تک نئی اسلامی تحریکیں معرضِ وجود میں آ رہی تھیں اگر امریکہ ان اسلامی تحریکوں کو کمیونزم کے خلاف لڑنے کے لئے سرد جنگ میں استعمال نہ کرتا تو آج دنیا کا نقشہ اور تاریخ کا رخ کچھ اور ہی ہوتا۔

اگر ہم بیسویں صدی کی درمیانی دہائیوں کو دیکھیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں کا ایک بھی قومی لیڈر شدت پسند نہ تھا۔ ترکی کا کمال اتاترک' الجیریا کا احمد بن بلا' انڈونیشیا کا سوئیکارنو' پاکستان کا محمد علی جناح' مصر کا جمال عبدالناصر اور ایران کا محمد مصدغ' یہ سب آزاد خیال سیکولر لیڈر تھے۔ یہ سب مسلمان اور عرب لیڈر معاشی طور پر اپنی قوموں کو آزاد' خودمختار اور خودکفیل دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ استعماریت کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے اور اپنے قومی سرمایے کو اپنی قوم کی بہتری کے لئے خرچ کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے مغربی حرص کے ساتھ ان کا تضاد لازمی تھا۔ وہ سب لیڈر پہلے برطانوی اور پھر امریکی استعماریت کے لیے ایک چیلنج بن گئے۔ برطانیہ اور امریکہ نے ان سیاسی لیڈروں کو دوست بنا کر ورغلانہ شروع کیا تاکہ ان کے وسائل پر قبضہ کیا جا سکے۔ اس کوشش میں انہوں نے سعودی عرب کی ماضی پرست اسلامی حکومت سے گٹھ جوڑ کیا' ۱۹۵۲ء میں سی آئی اے نے ایران میں مصدغ کی حکومت کا تختہ الٹ کر رضا شاہ پہلوی کو حکمران بنایا' برطانیہ نے ناصر کو نشانہِ ہدف بنایا اور انڈونیشیا میں سوئیکارنو کو ہٹا کر سوہارتو کو حکومت دی اور خون کی ہولی کھیلی جس میں لاکھوں معصوم جانیں ضائع ہو گئیں۔

۱۹۷۹ء میں جب روس نے افغانستان پر حملہ کیا تو عالمی تضاد اور بھی شدید ہو گیا۔ امریکہ نے کمیونزم کے اس 'شیطانی نظام' کا مقابلہ کرنے کے لئے تمام اسلامی ممالک سے رجوع کیا۔ اس موڑ پر

پاکستان کا ضیاء الحق امریکہ کا دوست بن گیا' سعودی عرب نے مالی مدد کی اور سی آئی نے مصر' سعودی عرب' سوڈان' الجیریا اور بہت سے دیگر مسلم ممالک سے مجاہدین جمع کرنے شروع کر دیے۔ اسلامی شدت پسندوں کے خون میں کمیونزم کے خلاف جہاد کے نام پر ابال لایا گیا۔ امریکہ کا یہ حربہ کامیاب ہوا۔ ۱۹۸۸ء میں روس کی فوجیں افغانستان سے دم دبا کر بھاگیں جسے امریکی' پاکستانی' سعودی اور مصری حکومتوں اور فوجوں نے اپنی فتح سمجھا۔ یوں لگتا تھا کہ تاریخ کا ایک اور باب پایہِ تکمیل تک پہنچا لیکن وہ ایک سراب تھا۔ اس جنگ کی قیمت کا اندازہ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ ستمبر ۲۰۰۱ء کے حادثے سے پہلے ہی واضح ہو رہا تھا کہ امریکہ نے اسلامی تشدد پسندی کا خطرناک جن پیدا کر دیا ہے ایک ایسا جن جو اب اس کے اختیار سے باہر ہے۔

یہ سب واقعات اب تاریخ کا حصہ ہیں جنہیں کوئی بدل نہیں سکتا لیکن ان کے نتیجے میں مغرب اور خاص طور پر امریکہ کے مسلمان دنیا سے تعلقات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں اور ثقافتوں کا تضاد بڑھتا جا رہا ہے۔ اس بڑھتے ہوئے تضاد اور طوفان کو کیسے روکا جا سکتا ہے؟ اگر امریکہ کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو جائے اور وہ حالات بہتر بنانا چاہے تو اسے مندرجہ ذیل دس اقدامات لینے چاہئیں۔

پہلا قدم۔۔ جیسا کہ دنیا کے بہت سے مسلم اور غیر مسلم ممالک کا مطالبہ ہے کہ امریکہ کو اپنا رویہ بدلنا چاہئیے۔ اسے عالمگیر حکومت کے خواب کو خیر باد کہنا چاہیے۔ یہ خواب امریکی ریپبلکن پارٹی نے ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء سے بہت پہلے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ڈیموکریٹک پارٹی نے آہستہ آہستہ عراق کی جنگ کی مخالفت کرنی شروع کر دی ہے لیکن وہ بھی ساری دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق بدلنا چاہتی ہے۔ امریکیوں کو یہ جاننا چاہیے کہ انہیں باقی ملکوں کی طرح بین الاقوامی قوانین کا احترام کرنا چاہیے اور ان کے پاس

کوئی خداداد اجازت نامہ نہیں ہے کہ وہ ساری دنیا پر اپنا حکم نافذ کریں۔ برطانیہ کو بھی ٹونی بلیر کی رخصتی کے بعد اپنی جداگانہ خارجہ پالیسی بنانی چاہیے اور امریکہ سے علیحدگی اختیار کر کے مسلمان ممالک سے اپنے بہتر روابط استوار کرنے چاہئیں۔

دوسرا قدم۔۔فلسطین کی آزاد ریاست میں مزید تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔فلسطینیوں کی جلاوطنی مسلمانوں کے لیے ایک اہم سیاسی مسئلہ بن کر ایک استعاراتی اہمیت حاصل کر چکا ہے۔اس مسئلے کے تسلی بخش حل کے بغیر مغربی دنیا اور مسلم امہ کے درمیان پرامن تعلقات استوار نہیں ہو سکتے۔امریکہ نے اسرائیلیوں کو فلسطینیوں پر حملہ کرنے کی کھلی چھٹی دے رکھی ہے جس کی وجہ سے اسرائیل نے لبنان پر ۱۹۸۲ء اور ۲۰۰۶ء میں حملے کیے۔امریکی اصحابِ بست وکشاد مقبوضہ علاقوں کے بارے میں خاموش رہتے ہیں۔حماس اور الفتح کے آپس میں اختلافات کا یہ مطلب نہیں کہ فلسطینیوں کے مسائل حل ہو گئے ہیں۔ان کے اختلافات سے مسائل اور تضادات میں شدت پیدا ہوتی ہے اور دہشت گردی میں اضافہ ہوتا ہے۔اگر فلسطینی ریاست نہ بنائی گئی تو یہ مسئلہ بد سے بدتر ہوتا جائے گا۔

تیسرا قدم۔۔امریکہ کو عراق اور افغانستان کی جنگ میں مارے گئے معصوم عوام کی ذمہ داری لینی چاہئے۔امریکی سپاہی بے گناہ عوام کا خیال نہیں رکھتے اور ان کی موت کی چھوٹی سی رقم دے کر ان کے خاندانوں کو ٹال دیتے ہیں۔پچھلے دنوں کارل انڈرفرتھ Karl Inderfurth نے جو بل کلنٹن کی حکومت کا اسسٹنٹ سیکرٹری تھا' کہا ہے کہ جوں جوں افغانی عوام قتل ہو رہے ہیں افغانیوں کے دلوں اور دماغوں میں امریکہ اور نیٹو NATO کے خلاف منفی جذبات ابھر رہے ہیں۔جنرل بیری مے کیفری General Barry McCaffrey نے بھی افغانستان کے دورے کے بعد امریکی حکومت کو

مشورہ دیا ہے کہ ان کی پوری کوشش ہونی چاہیے کہ اس جنگ میں بے گناہ عوام کی جانیں ضائع نہ ہوں۔

چوتھا قدم۔۔امریکہ کو ایٹم بم بنانے کی کوشش کی وجہ سے ایران پر حملہ کرنے کی دھمکی نہیں دینی چاہیے خاص طور پر جب کہ وہ اسرائیل، ہندوستان، پاکستان اور شمالی کوریا کو ایٹم بم بنانے پر مراعات دے رہا ہے۔سنڈے ٹائمز Sunday Times لندن کی خبر کے مطابق امریکہ نے ایران پر حملہ کر کے تین دن میں ۱۲۰ ایٹمی اھداف کو تباہ کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ایران کو ایٹم بنانے سے پر امن مذاکرات سے روکنے کی کوشش کرنی چاہیے۔امریکہ کو کسی اور ملک کو ایٹم بم بنانے سے روکنے کا کوئی اخلاقی جواز نہیں ہے کیونکہ نہ صرف امریکہ خود ایٹم بم چھپائے بیٹھا ہے بلکہ اس نے ایران کو شاہ کے زمانے میں ایٹم بم بنانے میں مدد بھی کی تھی۔امریکہ نے اقوامِ متحدہ کے ساتھ مل کر کام کرنا بند کر دیا ہے۔وہ ایرانی رہنماؤں کے ساتھ بالمشافہ مذاکرات کرنے کو بھی تیار نہیں ہے۔ایرانی صدر نے امریکی صدر کو جو دعوت دی تھی اسے بھی امریکہ نے درخورِ اعتنا نہیں جانا۔شمالی کوریا کے ایٹم بم نے ثابت کر دیا ہے کہ امریکہ کی خارجہ پالیسی ناکام ہو چکی ہے۔شمالی کوریا کو دھمکیاں دینے کی بجائے اس سے تیل کے تبادلے کے مذاکرات زیادہ کامیاب رہے ہیں۔

پانچواں قدم۔۔امریکہ کو مسلم دنیا میں شیعہ سنی تضاد سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دونوں مذہبی گروہوں کو کمزور کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔یہ بظاہر ایک چالاک چال دکھائی دیتی ہے لیکن مذہبی جذبات ابھار کر ان سے سیاسی فائدہ اٹھانا ایک خطرناک عمل ہے۔ایسے جادوئی عمل سے ایسے عفریت پیدا ہوتے ہیں جن کی عادت ہے کہ آخر میں وہ اپنے مالکوں پر ہی حملہ آور ہو جاتے ہیں اس عمل کی چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں

۔۔سی آئی اے کا افغانستان میں مجاہدین پیدا کرنا

۔۔اسرائیلی حکومت کا حماس کا تجربہ

۔۔پاکستان میں جہادی تنظیمیں پیدا کرنا

اور

۔۔ہندوستان میں سکھ شدت پسندوں کا ساتھ دینا

امریکہ کے سیاسی شاطر مسلم دنیا میں مذہبی اور سیاسی تضادات اور فرقہ وارانہ چشمک سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ القاعدہ اور عراق اور لبنان کی سنی جماعتیں اب ایران اور حزب اللہ کو امریکیوں سے زیادہ اپنا دشمن سمجھتی ہیں۔اب ان کی خواہش ہے کہ امریکہ ایران پر حملہ کرے اور ایٹم بم پھینکے۔عین ممکن ہے کہ وہ ایسا کروانے کے لئے امریکہ کو للکاریں۔

چھٹا قدم۔۔امریکہ کو جمہوریت کے گن گانے کے ساتھ ساتھ جنرل مشرف اور حسنی مبارک جیسے آمروں کا ساتھ نہیں دینا چاہیے۔ایسا کرنے سے مسلم عوام میں امریکہ کے خلاف غصہ اور نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جو امریکہ کے لئے خطرے کا باعث ہیں۔امریکی حکومت کا منافقانہ رویہ ساری دنیا پر عیاں ہوتا جا رہا ہے۔

ساتواں قدم۔۔مغربی دنیا کو ایسے مواقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے جن میں وہ غاصب کی بجائے سخی اور ہمدرد دکھائی دیں۔۲۰۰۴ء میں سونامی کے سیلاب اور ۲۰۰۵ء میں کشمیر کے زلزلے سے متاثر ہونے والے عوام کی خدمت کرنا اس کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔مسلمان ممالک سے مذہبی شدت اور تشدد پسندی کے لئے ضروری ہے کہ مغربی دنیا غریب عوام کی معاشی اور معاشرتی حالت بہتر بنائے اور صرف اعلیٰ طبقے کی

ہی مالی امداد نہ کرے۔

آٹھواں قدم۔۔امریکہ کو بین الاقوامی عدالت کا احترام کرنا چاہیے۔امریکہ نے ابوغریب اور گوٹینا موبے میں جو مظالم ڈھائے ہیں وہ اس کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہیں۔امریکہ نے دہشت گردوں کو پکڑنے کے لئے بین الاقوامی قوانین کی بے حرمتی کی ہے۔اس کا کردار اس کے دشمنون سے بہتر نہ تھا۔امریکہ کو مشتبہ قیدیوں پر مظالم ڈھانے کے لئے انہیں شام' پاکستان اور مصر نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔جن لوگوں پر دہشت گردی کا الزام تھا ان سے ضروری معلومات حاصل کرنے کے لئے امریکیوں کو جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے تھا۔

نواں قدم۔۔امریکی فوجیوں اور افسروں کو مسلمانوں کی مذہبی عمارات اور مقدس چیزوں کا احترام کرنا چاہیے۔گوٹینا موبے میں امریکی فوجیوں نے قرآن کو پاخانے میں پھینک کر اس کی بے حرمتی کی تھی۔امریکی فوج اور حکومت کو جلد اندازہ ہو گیا کہ ایسے اقدامات سے مذہبی شدت پسندی کو ہوا ملتی ہے۔سلمان رشدی کو 'سر' کا خطاب دینا بھی اس کی ایک مثال تھی۔رشدی کا ادبی مرتبہ اپنی جگہ لیکن اس خبر سے بھی مسلمانوں کے مذہبی جذبات مشتعل ہو گئے تھے۔

دسوان قدم۔۔مغرب میں بسنے والے مسلمانوں کے ساتھ متعصّبانہ رویہ ایک غیر اخلاقی عمل ہے۔امریکہ میں عیسائی' یہودی اور ہندو اداروں پر وہ پابندیاں نہیں ہیں جو مسلمانوں پر ہیں۔ایک سیکولر حکومت کو سب مذاہب کا یکساں احترام کرنا چاہیے۔امریکی مسلمان غیر منصفانہ رویہ سے پریشان ہیں۔امریکی سکولوں میں تمام مذاہب کے بچوں کو برابر کی اجازت ہونی چاہیے۔تمام مذہبی سکول اور مدرسے بند کر دینے چاہئیں لیکن امریکہ میں عیسائی شدت پسند غالب آتے جا رہے ہیں جو معاشرے

میں انجیل کی تعلیم عام کر کے عیسائی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ انگلستان کو بھی فرانس کی طرح اپنے نظام کو سیکولر بنانا چاہیے اور ترکی کی طرح حکومتی اداروں میں برقعہ پہننے پر پابندی عاید کرنی چاہیے۔

مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟

جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو بہت سی ناانصافیاں دکھائی دیتی ہیں۔ مسلمان ممالک کو اپنے کیے کا پھل مل رہا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے جو بوؤ گے سو کاٹو گے۔ اس مکافاتِ عمل کی ایک اعلیٰ مثال پاکستان ہے۔ پاکستان میں پچیس برس پیشتر ایک فوجی حکومت نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ:

۔۔حکومت کے اداروں میں نماز پڑھائی جائے گی

۔۔جو مسلمان رمضان میں روزے نہیں رکھیں گے انہیں سزا دی جائے گی

۔۔مردوں کو داڑھی بڑھانے کی دعوت دی جائے گی

۔۔حکومت کی نوکریوں کے لئے انٹرویو میں اسلامی تعلیمات کے بارے میں سوال پوچھے جائیں گے اور

۔۔بچوں کے سکولوں کی کتابوں میں جہاد کی تعلیم دی جائے گی

ستم ظریفی یہ ہے کہ آج ان فوجیوں پر جو اپنے آپ کو اسلام کے مجاہد سمجھتے ہیں غداری کا الزام لگایا جا رہا ہے اور ان پر اسلامی خودکش بموں سے حملے کرتے ہیں۔ ۲۰۰۱ء سے اب تک القاعدہ اور طالبان سے لڑتے لڑتے ایک ہزار سے زیادہ فوجی مارے گئے ہیں۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ فوج میں جہاد کی باتیں کرنے والے اور داڑھیاں بڑھانے والے فوجی افسروں کی مقبولیت میں اب کمی آ رہی ہے۔

پاکستان میں اسلامی شدت پسندوں کی مقبولیت کی ایک وجہ سیاسی لیڈروں کا مذہبی ملاؤں کے آگے گھٹنے ٹیک دینا بھی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو جو ایک سیکولر لیڈر تھا اپنی حکومت بچانے کے لیے مولویوں کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے

۔۔شراب پر پابندی لگائی

۔۔جمعہ کو چھٹی قرار دیا اور

۔۔احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا

بے نظیر بھٹو نے اپنی حکومت کے دور میں نہ تو شرعی حدود کو ختم کیا اور نہ ہی غیر منصفانہ بلیسفمی قانون Blasphemy Law کے خلاف کوئی قدم اٹھایا۔ نواز شریف نے بھی سعودی عرب کی تابعداری کرتے ہوئے پاکستان میں اسلامی شریعت نافذ کرنے کی کوشش کی۔

بنگلہ دیش میں بھی جماعتِ اسلامی اور اسلامی اوئے کی جوتے Oike Jote جیسی مذہبی جماعتوں نے وزیرِ اعظم خالدہ ضیا کا ساتھ دیا ہے۔ اس کے عہد میں احمدیوں اور ہندوؤں پر حملے بڑھ گئے تھے اور احمدیوں کی کتابوں پر پابندیاں لگا دی گئی تھیں۔ اس کی حکومت کے دوران مذہبی شدت اور تشدد پسندی میں اضافہ ہوا تھا۔ خالدہ ضیا نے اپنی مدِ مقابل شیخ حسینہ واجد کو نیچا دکھانے کے لئے مذہبی جماعتوں سے مدد حاصل کی تھی۔ دونوں لیڈروں نے ایک دوسرے پر مذہبی شدت پسندی کو ہوا دینے کے الزامات لگائے تھے اور اپنی سیاسی ذمہ داریوں سے کنارہ کشی اختیار کی تھی۔ ان سیاسی تضادات سے جماعتِ اسلامی نے فائدہ اٹھایا اور ملک میں ہزاروں اسلامی مدرسے کھول دیے اور جہادیوں کی تربیت کرنی شروع دی۔

بین الاقوامی طور پر اسلامی شدت پسندی میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی ساری ذمہ داری چند ملکوں پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ یہ ایک بدقسمتی کی بات ہے کہ دنیا میں سائنس اور ثقافت کی ترقی میں مسلمانوں کا دور دور تک کوئی نشان نہیں ہے۔ اس سے مسلمانوں میں احساسِ کمتری پیدا ہوا ہے اور وہ مذہبی شدت پسندی کی طرف راغب ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض ساری دنیا میں اسلامی خلافت کے خواب دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد امریکہ کے مسلم ممالک پر حملہ آور ہونے سے ساری دنیا کے مسلمان ایک چھت تلے جمع ہو جائیں گے اور مشترکہ دشمن ان کو متحد کر دے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟

مسلمانوں کو اکیسویں صدی کے حقائق کو قبول کرنا چاہیے اور یہ جان لینا چاہیے کہ آج کے دور میں انہیں اپنی ترقی کے لئے

۔۔سائنس اور جدید علوم کو پڑھنا چاہیے

۔۔معاشرے میں جمہوری اقدار کو پروان چڑھانا چاہیے

اور

۔۔مذہب کی بوسیدہ روایات کو چیلنج کرنا چاہیے

انہیں مغربی دنیا سے آزادی اور خودمختاری کے اصول اور اعلیٰ کام کرنے کے معیار، تخلیقی کاموں میں جدوجہد اور نئے تجربات کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔

اگر مسلمانوں کو نئی دنیا کا حصہ بننا ہے تو انہیں بین الاقوامی انسانی حقوق کی روایت کو گلے لگانا چاہیے جس کی رو سے مردوں اور عورتوں کے حقوق اور مراعات برابر ہیں۔ مغربی دنیا میں انہیں اپنی ڈیڑھ

اینٹ کی مسجد بنانے کی بجائے اس ملک کے عوام سے مل کر جل کر زندگی گزارنی چاہیے۔ مسلمانوں کو اپنی فرقہ وارانہ سیاست کی ذمہ داری لینی چاہیے اور اپنے مسائل کا سارا الزام اسلام کے دشمنوں پر نہیں ڈالنا چاہیے۔ انہیں اس تاریخی حقیقت کو قبول کرنا چاہیے کہ شیعہ سنی تضاد صدیوں سے چل رہا ہے اور ان کے مابین پہلی جنگ پیغمبر محمد کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہوئی تھی جس میں خون کے دریا بہہ گئے تھے۔

مسلمانوں کو اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ ان کے مسائل کا حل اسلامی حکومت اور شریعت میں نہیں ہے۔ انہیں خدا کی بجائے انسان کی فوقیت کو قبول کرنا چاہیے اور خلافت کا خواب دیکھنے سے احتراض کرنا چاہیے۔ ایسے نظام سے ملا طاقت حاصل کرتے ہیں۔ ایک جدید طرز کی حکومت سینکڑوں سال پرانے قوانین سے کیسے چل سکتی ہے۔ مسلمانوں کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ وہ

۔۔معاشی خوشحالی

۔۔انسانی حقوق کا احترام

۔۔جمہوریت

۔۔سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم

کے خواب دیکھیں اور جدید تعلیم اور سوچ کو عام کریں۔

جب تک مسلمان جمہوری اور انسانی آزادی کی اقدار کو نہیں اپنائیں گے وہ مذہبی شدت پسندی کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے۔ اسلام اور قرآن وہی ہیں لیکن سینکڑوں سالوں میں مسلمانوں کی اقدار اور طرزِ زندگی بدل چکے ہیں۔ اگر مسلمان ایک بہتر مستقبل کے خواب کو شرمندہِ تعبیر کرنا چاہتے ہیں اور اس دنیا

میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو انہیں اس جدید حقیقت کو قبول کرنا ہوگا۔

بائیں بازو کے لوگوں، جماعتوں اور تحریکوں کو کیا کرنا چاہیے

اگر کوئی کسی فلکی ستارے سے کرہِ ارض کو دیکھے تو اسے خون کے دریا بہتے نظر آئیں گے۔ یہ خون کے دریا مغربی استعماریت اور مذہبی تشدد پسندی کے درمیان جنگ کا نتیجہ ہیں۔ ان دونوں میں سے کسی کی کامیابی انسانیت کے مستقبل کے لئے اچھی نہیں۔

آج کے انسانی مسائل کا حل بائیں بازو کی تحریک اور نظریے میں مضمر ہے جنہیں مختلف مسائل کا جداگانہ حل تلاش کرنا ہوگا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بائیں بازو سے کیا مراد ہے؟

بائیں بازو کے نظام کی عمارت انسان دوستی کے خواب کی بنیادوں پر استوار ہے جس میں عوام کی معاشی اور معاشرتی خوشحالی اور سائنسی تعلیم اہم ہیں۔ وہ نظام ان کے مسائل کا حل اخلاقی حدود کے اندر رہ کر تلاش کرتا ہے۔ بائیں بازو کا یہ نظام مغرب کے استعماری نظام کے بھی حق میں نہیں ہے جو اسلام کو اپنا دشمن سمجھتا ہے اور مسلمانوں پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ وہ ان مسلمانوں کے بھی حق میں نہیں ہے جو مغرب سے اتنی دشمنی کرتے ہیں کہ اس کے خلاف دہشت گردی کو روا سمجھتے ہیں۔

بائین بازو کا فلسفہ کسی آسمانی صحیفے اور عقائد کا پابند نہیں ہے وہ ایک سیکولر نظام قائم کرنا چاہتا ہے جس میں ہر فرد کو آزادی ہوگی اور جس میں تمام شہریوں کے انسانی حقوق کا احترام کیا جائے گا۔ اس نظام میں تمام انسانوں کے رنگ، نسل، زبان، مذہب اور جنسی ترجیح کا احترام کیا جائے گا۔ بائیں بازو کی تحریکیں، نظام اور لوگ:

۔۔مزدوروں کو سرمایہ داروں سے

۔۔کسانوں کو جاگیرداروں سے

۔۔عورتوں کو مردوں سے

۔۔اقلیتوں کو اکثریتوں سے

۔۔چھوٹے ملکوں کو بڑے استعماری ملکوں سے

۔۔مسلمانوں کو مغرب کے اسلام دشمنوں سے

اور

۔۔مغربی دنیا کو دہشت گردوں سے بچانے کی کوشش کریں گے

ایک طرف مغربی استعماریت اور دوسری طرف مذہبی تشدد پسندی ہے یہ چکی کے دو پاٹ ہیں جن میں آج کی انسانیت پس رہی ہے۔تاریخ کے اس موڑ پر بائیں بازو کے لوگوں اور تحریکوں کو اپنا فعال کردار ادا کرنا ہوگا۔جورش بش کے چلے جانے کے بعد بھی امریکی بمبار طیارے مسلمانوں پر بم گراتے رہیں گے۔ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ امریکہ کا یہ کھیل زیادہ دیر تک نہیں چلے گا۔جب تک مسلمان یہ سمجھتے رہیں گے کہ امریکہ ان پر ظلم کر رہا ہے ان میں سے بعض جہادی تنظیموں میں شامل ہوتے رہیں گے۔آخر کار نہ تو امریکہ فاتح ہوگا اور نہ ہی اسلامی تشدد پسند کامیاب ہوں گے۔بائیں بازو کے لوگوں اور تحریکوں پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں امن اور سکون کی فضا قائم کریں اور مشرق اور مغرب کی شدت پسندی سے بالاتر ہو کر ایک عادلانہ اور منصفانہ نظام قائم کرنے کی کوشش کریں تا کہ انسانی مسائل کا تسلی بخش حل تلاش کیا جا سکے۔